شائستہ حمید خان

مولانا حامد علی خان، حالاتِ زندگی

مولانا حامد علی خان ایک صاحبِ کمال شخصیت تھے۔ انہوں نے اپنے علم وفن سے نہ صرف اپنی زندگی میں اپنے معاصرین کو متاثر کیا بلکہ آج بھی ان کے علمی اور ادبی اثاثے سے تشنگانِ ادب استفادہ کرتے اور اپنی علمی پیاس بجھاتے ہیں۔

مولانا حامد علی خان ۱۴ جنوری ۱۹۰۱ء کو وزیر آباد میں پیدا ہوئے۔ آپ کا تعلق ایک علمی خاندان سے ہے جو قول وعمل کی یکجائی کے لیے معروف ہے۔ آپ کے آباؤ اجداد راجپوت تھے۔ مولانا کے دادا مولوی کرم الٰہی نے وزیر آباد کے نواح میں کچھ رقبہ خرید کر ایک چھوٹا سا گاؤں آباد کیا جو انہی کے نام پر کرم آباد کہلایا۔ ۱۸۵۰ء میں مولوی کرم الٰہی کے ہاں ایک فرزند کی پیدائش ہوئی۔ جن کا نام اُنہوں نے سراج الدین احمد رکھا۔ مولوی کرم الٰہی نے اپنے بیٹے سراج الدین احمد کو انگریزی، فارسی اور عربی کی بہت اچھی تعلیم دلوائی۔ مولوی سراج الدین احمد نے دو شادیاں کیں، ان کی پہلی بیوی سے ان کے تین بیٹے مولانا ظفر علی خان، غلام حیدر خاں، محمد اکبر خان تھے۔ ان میں سے محمد اکبر خان کا جوانی میں ہی انتقال ہوگیا۔ مولوی سراج الدین احمد کی دوسری بیگم سے ان کے تین بیٹے اور دو بیٹیاں تھیں۔ بڑی بیٹی حمیدہ بیگم خود ایک اچھی شاعرہ تھیں وہ راجہ مہدی علی خان اور عثمان علی خان کی والدہ تھیں۔ دوسرے نمبر پر بیٹے محمود احمد خان تھے۔ جو کئی سال تک عثمانیہ یونیورسٹی میں کیمیاء کے پروفیسر رہے۔ آزادی کے بعد حکومت پنجاب کی مجلس ''اصلاحِ زبانِ دفتری'' کے صدر رہے۔ تیسرے نمبر پر

بیٹے حامد علی تھے، پھر پروفیسر حمید احمد خان تھے جو معروف نقاد، استاد اور پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے۔ اُردو، انگریزی اور فارسی زبان وادب پر بڑی دسترس رکھتے تھے۔ سب سے چھوٹی بیٹی زہرا بیگم جو معروف ادیبہ اور افسانہ نگار تھیں۔

مولوی سراج الدین احمد نے ۴ دسمبر ۱۹۰۶ء کو وفات پائی۔ ان کی وفات کے بعد ان کی وصیت کے مطابق، ان کے بڑے بیٹے مولانا ظفر علی خان نے ''زمیندار'' کی ادارتی خدمات سنبھال لیں اور اس کو بامِ عروج تک پہنچایا۔ مولوی سراج الدین احمد کی وفات کے وقت مولانا حامد علی خان صرف آٹھ برس کے تھے۔ مولانا ظفر علی خان نے حامد علی خان کی تعلیم و تربیت میں خصوصی دلچسپی لی۔ مولانا شعر و شاعری پر بھی دسترس رکھتے تھے۔ شعر و شاعری کے شغف سے ظفر علی خان بہت خوش ہوتے اور اکثر انعام و اکرام سے بھی نوازاتے تھے۔ مولانا ظفر علی خان کے علاوہ غلام حیدر خان اور محمود احمد خان بھی مولانا حامد علی خان کی مختلف امور میں مدد کرتے اور ان کے ساتھ شفقت کا برتاؤ رکھتے۔

مولانا حامد علی خان نے باقاعدہ تعلیم کا آغاز چرچ آف سکاٹ لینڈ ہائی سکول وزیر آباد اور اسلامیہ ہائی سکول بیرون بھاٹی دروازہ لاہور سے کیا۔ عبدالرحمٰن جو بعد میں جسٹس عبد الرحمٰن کہلائے، چرچ آف سکاٹ لینڈ ہائی سکول میں مولانا حامد علی خان کے ہم جماعت تھے اور ڈاکٹر تھامس گراہم بیلی ان کے اُستاد تھے۔

روزنامہ جنگ ۴ جولائی ۱۹۸۳ء کے ایک انٹرویو میں مولانا نے اپنی ابتدائی تعلیم کے بارے میں بیان کیا۔

''میری ابتدائی تعلیم چرچ آف سکاٹ لینڈ ہائی سکول وزیر آباد اور اسلامیہ ہائی سکول بیرون بھاٹی دروازہ لاہور میں ہوئی۔ ۱۹۱۴ء میں جب مولانا ظفر علی خان کرم آباد میں نظر بند ہو گئے تو ہمیں دوبارہ چرچ آف سکاٹ لینڈ سکول وزیر آباد میں آنا پڑا۔ اس وقت اس سکول کے مینیجر مشہور مستشرق ڈاکٹر گراہم بیلی تھے۔ مجھے اور میرے بھائی حمید احمد خان کو یہ فخر

حاصل ہے کہ نویں اور دسویں جماعت میں ہم ان کے شاگرد رہے۔ وہ ہمیں ٹھیٹ پنجابی زبان میں انگریزی پڑھایا کرتے تھے۔ پنجابی زبان پر انہیں حیرت انگیز قدرت حاصل تھی۔ غالباً ان کا خیال یہ تھا کہ ذریعہ تعلیم لوگوں کی اپنی زبان ہونا چاہیے۔''[۱]

ڈاکٹر گراہم بیلی کی بے تکلف گفتگو اور اپنے شاگردوں کے ساتھ بے تکلفی اکثر وقات مولانا حامد علی خان کو گراں گزرتی تھی۔ عبداللہ قریشی ''نقوش'' کے شخصیات نمبر پر ایک اسی قسم کا واقعہ لکھتے ہیں۔

''ڈاکٹر گراہم بیلی اپنے شاگردوں کو بے تکلفی سے خالص پنجابی طرز میں بلایا کرتے تھے۔ کسی کا نام شاہ محمد ہوا تو اسے جھٹ کہہ دیا او شاھنیا محمد اور عبدالحمید کو حمیدا، اسی طرح ایک دفعہ اُنہوں نے حامد علی خان کو سبق شروع کرنے کے لیے یوں مخاطب کیا چل بھئی حامدا، حامد علی خان کی عزت نفس نے یہ گوارا نہ کیا چنانچہ ایک دوست کو راز دار بنا کر ایک پلان تیار کیا کہ وہ انہیں ڈاکٹر بیلی کے سامنے انہی کی طرح حامدا، کہہ کر پکارے تا کہ یہ اس سے بگڑ کر ڈاکٹر بیلی کو حامدا کہنے سے روک سکیں۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا..... ڈاکٹر بیلی نے دونوں کو جھگڑتے دیکھ کر اپنے پاس بلایا اور حامد علی خان سے کہا، کیوں صاحب! حامدا کہنے میں کیا برائی ہے؟ مجھے تو اس میں کوئی خرابی نظر نہیں آتی، میں تو سمجھتا ہوں کہ یہ دوستی اور بے تکلفی کی نشانی ہے۔ میں نے کونسل ممبروں کو دیکھا ہے کہ وہ میاں محمد شفیع کو شفیا کہتے ہیں اور وہ بُرا نہیں مانتے، مگر جب ڈاکٹر گراہم بیلی کو شفیع کے صحیح ہونے اور شفیا میں خرابی واقع ہونے کا فرق معلوم ہو گیا تو اُنہوں نے حامد علی خان کو پورا نام لے کر پکارنا شروع کر دیا۔''[۲]

ابتدائی تعلیم سے فارغ ہو کر مولانا نے اسلامیہ کالج لاہور میں داخلہ لیا ہی تھا کہ تحریک خلافت شروع ہو گئی۔ آپ اس کے خلاف تھے، آپ کو جامعہ ملیہ اسلامیہ علی گڑھ کے ڈاکٹر محمد عالم نے اسلامیہ کالج لاہور کو چھوڑ کر علی گڑھ آنے کی دعوت دی۔ چنانچہ مولانا تعلیم چھوڑ کر علی گڑھ چلے گئے اور بعد میں مولانا حامد علی خان نے نیشنل یونیورسٹی کالج میں داخلہ لیا،

اور ایف اے کا امتحان فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا۔ بی۔اے بھی اسی یونیورسٹی سے درجہ اوّل میں پاس کیا اور بقول بیگم حامد علی خان:

''بی۔اے میں آپ کے مضامین تاریخ، اقتصادیات، سیاسیات اور اُردو تھے''[۳]

عبداللہ قریشی ''نقوش'' کے شخصیات نمبر میں لکھتے ہیں:

''اس یونیورسٹی کا نظام تعلیم امریکن یونیورسٹیوں کی طرز کا تھا۔ گاندھی جی نے حامد علی خان اور دوسرے کامیاب طلبہ کو اپنے ہاتھ سے سند عطا کی اور جلسہ تقسیم اسناد کے بعد الگ جا کر باتیں بھی کیں۔''[۴]

۱۹۲۳ء میں مولانا حامد علی خان نے نیشنل یونیورسٹی سے بی۔اے کیا اور اسی سال مولانا اسی یونیورسٹی میں اکنامکس اور اُردو کے پروفیسر مقرر ہوگئے۔ یہ یونیورسٹی بریڈلاء ہال لاہور کے متصل واقع تھی اور بریڈلاء ہال کالج ہال تھا جو اس وقت کانگریس کا بہت بڑا مرکز تھا۔ محمد عبداللہ قریشی لکھتے ہیں:

''ملک کے تمام بڑے بڑے قومی راہنما وقتاً فوقتاً یہاں آتے تھے اور حامد علی خان کو ان کے خیالات سننے کا اکثر موقع ملتا رہتا تھا۔ طبیعت میں انگریز دُشمنی اور آزادی کی تڑپ شروع ہی سے موجود تھی۔ گویا ابتدائے عشق ہی میں آگ تھے۔ مسٹر گاندھی، سی، آر داس، لالہ لاجپت رائے، مولانا ابوالکلام آزاد، پنڈت مدن موہن، مسز سروجنی نائیڈو اور دیگر محبِ وطن اور آزادی پسند زعما کی تقریروں نے جلتی پر تیل کا کام کیا اور آپ شعلہ جوالہ بلکہ آتش کا پرکالہ بن گئے۔ آپ عام شوریدہ سر نوجوانوں کی طرح اپنے جوش کا اندھا دھند اظہار نہ کرتے تھے اسے پوری قوت سے اپنے سینے میں چھپائے اور دبائے رکھتے تھے۔''[۵]

مولانا نے قریباً چھ ماہ تک اسی یونیورسٹی میں تدریس کے فرائض سرانجام دیے بعد ازاں وہ ''ہمایوں'' سے وابستہ ہوگئے۔ ''ہمایوں'' کے مدیر میاں بشیر احمد صاحب نے ''ہمایوں'' کو اپنے والد کی یاد میں جاری کیا تھا اور اس کو چلانے کے لیے متعین خطوط واضح کیے تھے۔

مولانا حامد علی خان نے ان کے مقاصد کو اپناتے ہوئے ''ہمایوں'' کو قریباً اٹھارہ برس بڑی کامیابی سے چلایا۔ میاں بشیر اپنی مصروفیات کے باعث ''ہمایوں'' کو زیادہ وقت نہ دے سکتے تھے، اس لیے اُنہوں نے ادارت کی تمام ذمہ داری مولانا حامد علی خان کے سپرد کر دی۔ جسے مولانا نے بخوبی سرانجام دیا۔ اسی عرصہ میں مولانا نے ایک ادبی مجلس ''اُردو سبھا'' کے نام سے قائم کی، اس حوالے سے مولانا حامد علی خان نے اپنے انٹرویو میں کہا:

''''ہمایوں' کے زمانہ ادارت میں مولانا تاجور کے مشورے کے مطابق، میں نے ایک ادبی مجلس 'اُردو سبھا' کے نام سے قائم کی۔ مولانا تاجور نے یہ نام اس لیئے تجویز کیا کہ کسی زمانے میں سر عبدالقادر نے اس نام سے ایک ادبی انجمن قائم کرنے کا خیال ظاہر کیا تھا۔ میری بھی ہمیشہ سے یہ کوشش رہی کہ مسلمانوں کے علاوہ غیر مسلم حضرات کو بھی اُردو کی طرف مائل کیا جائے۔ چنانچہ میں نے اُردو کے مشہور محقق علامہ برج موھن دتاتریہ کیفی کو اُردو سبھا کی مستقل صدارت قبول کرنے پر رضا مند کر لیا۔ نائب صدر حضرات میں پطرس بخاری، غالبؔ کے شاگرد مرزا ہرگوپال تفتہ کے نواسے ڈاکٹر شانتی سروپ بھٹناگر، صدر شعبہ کیمیا پنجاب یونیورسٹی خواجہ دل محمد اورئینٹل کالج لاہور کے پروفیسر ڈاکٹر موہن سنگھ دیوانہ شامل تھے۔''[۶]

اُردو سبھا کے اجلاسوں کے لیئے سر ایس۔ ایس بھٹناگر نے کیمیکل لیبارٹری کو وقف کر کے اُردو نوازی کا ثبوت دیا۔ اس پر روشنی ڈالتے ہوئے عبداللہ قریشی لکھتے ہیں:

''اُردو سبھا کے جلسے ڈاکٹر بھٹناگر کے زیر اہتمام پنجاب یونیورسٹی کی کیمیکل لیبارٹری میں ہوا کرتے تھے۔ وہ اُردو کے والہ وشیدا تھے۔ اس لیئے سبھا کی کارروائیوں میں بہت دلچسپی لیتے تھے۔ علامہ کیفی نے اس سبھا میں بہت دلچسپ اور مفید مقالات پڑھے، جن میں سے نئی شاعری کا پہلا مشاعرہ تذکیر و تانیث، اور اُردو کی موجودہ ضروریات وغیرہ شامل ہیں۔ بعد میں رسالہ 'اُردو' اور 'ہمایوں' میں بھی چھپے اور کیفی صاحب کی کتاب منشورات کی زینت بھی بنے۔''[۷]

مولانا حامد علی خان ''کل ہند انجمن اُردو'' کے بھی شریک معتمد رہے۔ ''کل ہند

انجمن اُردو' میاں بشیر احمد نے اُردو کی تبلیغ و اشاعت کے لیئے قائم کی تھی۔ بعد ازاں مولانا نے، اُردو سبھا کو ''کل ہند انجمن اُردو'' میں ضم کر دیا۔ اس کے بارے میں مولانا نے بتایا:

''میں نے اُردو سبھا کے ارکان کی اجازت سے جو اُنہوں نے بادل نخواستہ مجھے دی 'اُردو سبھا' کو انجمن اُردو میں ضم کر دیا۔''[۸]

انجمن اُردو نے فروغ اُردو کے لیے بہت سی خدمات سرانجام دیں، ان کا ذکر کرتے ہوئے مولانا نے اپنے انٹرویو میں بتایا:

''انجمن اُردو نے اُردو کی ترقی اور اشاعتی کاموں کے علاوہ مشاعروں کا انعقاد بھی کیا۔ ایک کل ہند اُردو مشاعرہ، یادگار مشاعرے کی حیثیت رکھتا ہے جو موجودہ اقبال پارک لاہور میں منعقد ہوا۔ اور اس میں برعظیم کے بہت مشہور شعراء تشریف لائے تھے۔ اس میں شاعر عظیم حضرت جوش ملیح آبادی بھی شامل تھے، اس مشاعرے کا اہتمام اس انداز سے کیا گیا تھا کہ کافی مدت گزر جانے کے باوجود اس کے نقوش ابھی تک میرے ذہن میں موجود ہیں۔''[۹]

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مولانا حامد علی خان نے اُردو زبان و ادب کی ترقی و ترویج کے لئے مختلف انجمنیں بنائیں۔ اجلاس کروائے، مشاعرے کروائے، مقالے لکھے، اور لکھوائے تراجم کیے اور کروائے اور جہاں تک ہوسکا اُردو کی ترقی کے لیئے ہمیشہ ہی کوشاں رہے۔

۱۹۳۰ء میں مولانا نے لاء کالج لاہور میں داخلہ لے کر قانون کی تعلیم حاصل کرنا شروع کی مگر دوران تعلیم ایک ناخوشگوار واقعہ کی وجہ سے تعلیم چھوڑ دی، اس واقعہ کی روداد عبداللہ قریشی اس طرح بیان کرتے ہیں:

''لاء کالج لاہور کی طالب علمی کے دنوں میں بھگت سنگھ اور دت جیسے پُر جوش نوجوانوں کو پھانسی کے تختے پر لٹکایا گیا۔ اور ان کی لاشیں جلا کر راکھ دریا میں بہا دی گئی۔ لاہور

میں ان کے ماتمی جلوس نکلے۔ جب ایک ایسا ہی جلوس لاء کالج کے سامنے سے گزرا تو آپ نے دیکھا کہ نوجوانوں کی آنکھیں پُرنم ہیں۔ وہ بے حال غم کی مجسّم تصویر بنے سر جھکائے ماتمی جلوس کی صورت میں جا رہے ہیں۔ اور پوری فضا پر سوگ طاری ہے۔ بھگت سنگھ نیشنل کالج میں ان کا شاگردرہ چکا تھا۔ بس پھر کیا تھا۔ دبی ہوئی باردود کو آگ لگ گئی۔ ایک شعلہ دل میں بھڑکا اور آپ نے آگے بڑھ کر بے اختیار بھگت سنگھ زندہ باد کے تین نعرے لگائے، جن سے جلوس میں جوش اور حرارت کی لہر دوڑ گئی۔ چنانچہ جلوس ان کی آواز پر زندہ باد کے نعرے بلند کرتا ہوا آگے نکل گیا۔ آپ نے پلٹ کے دیکھا تو پیچھے دوسرے طلبہ اور اساتذہ کے ساتھ لاء کالج کے پرنسپل مسٹر سی۔ ایل آنند کھڑے آپ کی اس حرکت پر مسکرا رہے تھے۔''[۱۰]

۱۶ مئی ۱۹۳۷ء کو مولانا حامد علی خان کی شادی، ستائیس برس کی عُمر میں ہوئی۔ ان کی بیگم کا تعلق وزیر آباد کے اچھے متمول خاندان سے تھا۔ مولانا حامد علی خان کے سُسر تحصیلدار تھے۔ بیگم حامد علی خان نے بتایا کہ:

''شادی کے وقت میری عُمر سولہ برس تھی اور ہماری شادی بزرگوں کی مرضی سے ہوئی۔ اُس وقت مولانا حامد علی خان لاہور میں رہائش پذیر تھے جبکہ میں وزیر آباد میں رہتی تھی۔''[۱۱]

مولانا حامد علی خان کی اولاد میں اُن کے دو بیٹے اور ایک بیٹی شامل ہیں۔ بڑے صاحبزادے شاہد علی خان اور دوسرے بیٹے زاہد علی خان ہیں جبکہ بیٹی فائقہ بانو جن کی شادی مولانا کے بھتیجے سعید احمد خان سے ہوئی، بیرون ملک رہائش پذیر ہیں۔

مولانا حامد علی خان نے ۱۹۴۲ء میں ایم۔ اے عربی کے لیئے اورینٹل کالج لاہور میں داخلہ لیا۔ ان دنوں انڈین نیشنل کانگریس کی طرف سے یوم آزادی منایا جانے لگا۔ ہندو طالب علموں نے اس موقع پر کانگرس کا جھنڈا لہرانے کی تیاری کی۔ اُنہوں نے حامد علی خان کو بھی اس تقریب میں شرکت کی دعوت دی، مگر مولانا حامد علی خان نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ

کانگرس مسلمانوں کی قومی حیثیت کو تسلیم نہیں کرتی، اس لیے میں اس میں شریک نہیں ہوسکتا۔ چنانچہ کانگرس کا جھنڈا نصب کرتے ہی مسلمان طلبہ نے بھی اورینٹل کالج میں مسلم لیگ کا جھنڈا گاڑ دیا۔ چونکہ کانگرس اور مسلم لیگ دونوں جماعتیں حکومت کے خلاف تھیں۔ اس لیے کالج کے ارباب خاص ڈر گئے، اور اُنہوں نے یونین جیک کھڑا کرنے میں بہتری سمجھی۔ یونین جیک دیکھ کر ہندو طلبہ سخت ناراض ہوئے اور اُنہوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ اس کو کسی طرح اُتروا دیا جائے۔ مولانا کو جب ان سب حالات کا علم ہوا تو آپ جوش میں آ گئے، اور کانگریس پارٹی کے نوجوانوں سے کہا، کہ اب میں آپ کے ساتھ ہوں۔ اس کے بعد آپ ان نوجوانوں کی ترجمانی کرتے ہوئے بورڈنگ ہاؤس کے سپرنٹینڈنٹ کے سامنے حاضر ہوئے۔ نہایت مناسب الفاظ میں اپنے جذبات کا اظہار کیا اور کہا کہ بورڈنگ میں ہندو طالب علم رہتے ہیں، اس لیے کانگرس کا جھنڈا لہرانا مناسب ہے۔ بورڈنگ میں مسلمان طالب علم بھی قیام پذیر ہیں اس لیے مسلم لیگ کا جھنڈا لہرانا بھی سمجھ میں آتا ہے۔ لیکن انگریز کون ہیں؟ جس کی نمائندگی یونین جیک کر رہا ہے۔ اس احتجاج کے بعد کالج کے منتظمین کو یونین جیک اُتارنا پڑا۔ اسی دن مولانا حامد علی خان کی ملاقات میاں بشیر احمد، محمد شفیع اور مولوی عبدالحق سے بھی ہوئی۔

مولانا حامد علی خان جب اورئینٹل کالج میں زیر تعلیم تھے تو کالج کی مجلس ادب کے معتمد رہے، اور اس کے زیر اہتمام ادبی محافل اور مشاعرے منعقد کرواتے رہے۔ مولانا حامد علی خان طلبہ کی غزلوں پر اصلاح دیتے تھے، اور اکثر طلبہ کو غزلیں لکھ کر بھی دیں تاکہ ہندو نوجوانوں کو اُردو کی طرف متوجہ کیا جاسکے۔ اسی دوران مولانا حامد علی خان کی حفیظ جالندھری سے پہلی ملاقات ہوئی اس ملاقات کا بیان آپ نے اس طرح کیا:

''ایک اور مشاعرے میں جس کے صدر علامہ تاجور نجیب آبادی تھے نوجوان حفیظ جالندھری سے پہلے پہل شناسائی ہوئی وہ ازراہ کرم خود ہی تشریف لے آئے تھے۔ اس مشاعرے میں اُنہوں نے دو غزلیں ترنم سے سنائیں، نوجوان طلبہ اس قدر متاثر ہوئے کہ بعد

میں حفیظ کے بعض اشعار ہفتوں تک طلبہ کی زبانوں پر رہے۔ حفیظ صاحب سے جو ولی رابطہ اس وقت پیدا ہوا وہ اس سے ظاہر ہے، کہ مشاعرے کے بعد کالج سے بھاٹی دروازہ تک حفیظ صاحب اور میں ہاتھ میں ہاتھ ڈالے پیدل اپنے گھروں کو پہنچے اور یہ تعلق تا عمر قائم رہا۔'' ۱۲

اورینٹل کالج میں ایم۔ اے عربی کے دوسرے سال کے آخر میں ن۔م۔ راشد نے آپ کو آل انڈیا ریڈیو دہلی بلایا اور بطور ادبی مشیر کام کرنے کی دعوت دی۔ مولانا وہاں اگست ۱۹۴۷ء تک کام کرتے رہے اور پطرس اُن دنوں آل انڈیا ریڈیو کے سربراہ تھے۔ مولانا حامد علی خان ریڈیو میں صحت الفاظ کے منصب پر فائز تھے۔ ان کو زبان کے معاملے میں سند خیال کیا جاتا تھا۔ بیگم حامد علی نے انٹرویو میں بتایا:

''مولانا ۱۹۴۵ء میں دہلی چلے گئے تھے اور وہاں لٹریری ایڈوائزر (مشیر ادبی) تھے اور غزلیات کا تلفظ درست کرتے تھے۔ دہلی والے بڑے پریشان ہوئے کہ اب پنجاب سے آئیں گے ہمیں تلفظ سکھانے اور اُردو سکھانے۔ شاہد احمد دہلوی مولانا کے دوست تھے اُن کے رسالے 'ساقی' میں بھی کسی نے لکھ دیا کہ اب دہلی والوں کا تلفظ درست کرانے اور اصلاح زبان کے لیئے لوگ پنجاب سے بلائے جائیں گے، جب شاہد احمد دہلوی کو اس بات کا علم ہوا کہ ان کے رسالے میں یہ بات لکھی گئی ہے تو آپ نے مولانا کی طرف آنا چھوڑ دیا اور جب تک 'ساقی' رسالہ میں اس بات کی معذرت نہیں کی اور یہ واضح نہیں کیا کہ ان کا آنا بہت ضروری تھا۔ اُس وقت تک مولانا کے گھر اُن سے ملنے نہیں گئے۔'' ۱۳

مولانا حامد علی خان کے ذمے ایک کام یہ بھی ہوتا تھا کہ ریڈیو پر گانے والوں کے گانے پہلے ان سے گوا کر سنتے تھے تا کہ پتا چل سکے کہ جس دُھن میں یہ غزل گائی جائے گی اس دُھن سے غزل کی بحر یا گیت کے وزن کو تو کوئی ضعف نہیں پہنچ رہا ہے۔

مولانا حامد علی خان کی زبان دانی کے بارے میں اخلاق احمد دہلوی صاحب نے اپنے کالم ''یادوں کے سفر'' میں لکھا:

''مولانا حامد علی خان ریڈیو میں صحت الفاظ کے منصب پر فائز تھے، اور ان سے کوئی لفظ یا کسی لفظ کا تلفظ پوچھتے ہوئے لوگ اس لیئے کتراتے تھے کہ محمود نظامی نے جو اس زمانے میں دہلی کے ریڈیو اسٹیشن میں اسسٹنٹ ڈائریکٹر تھے یہ لطیفہ مولانا حامد علی خان کے بارے میں پھیلا رکھا تھا کہ ایک دن اُنہوں نے مولانا حامد علی خان سے خضر کا تلفظ پوچھا تو اُنہوں نے بیسیوں اشعار اساتذہ کے سنا ڈالے .....لیکن محمود نظامی صاحب نے اپنی طرف سے اپنے انداز کا مبالغہ اس میں یہ کیا کہ دن بھر تو دفتر میں انہیں گویا ان الفاظ کے تلفظ کے سلسلے میں وہ اساتذہ کے شعر سناتے رہے اور رات کوئی دس بجے ان کے گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا اور جب محمود نظامی صاحب نے دروازہ کھولا تو حامد صاحب ایک گدھا لئے کھڑے ہیں جس کے دونوں طرف ایسی کتابیں لدی ہوئی ہیں جن میں خصر اور سخن کے وہ تلفظ ہیں جو اساتذہ نے مناسب جانے گردانے اور باندھے ایک طرف اساتذہ کے دواوین اور دوسری طرف مستند لغات کی جلدیں۔''[۱۴]

مولانا حامد علی خان کی آل انڈیا ریڈیو دہلی کی ملازمت کے دوران آپ کی تحویل میں اُردو کے ممتاز شعراء کے کلام کا انتخاب اور دواوین دے دیئے گئے تا کہ ریڈیو پر نشر ہوں۔ آپ نے منتخب کلام کی دو نقلیں کروائیں ایک نقل دفتر میں ان کے پاس محفوظ رہی اور دوسری بوقت ضرورت استعمال ہوتی رہی۔ ۱۹۴۷ء کے فسادات کی وجہ سے مولانا حامد علی خان نے آل انڈیا ریڈیو کی ملازمت سے استعفیٰ دے دیا۔ حسن رضوی کے سوال کے جواب میں مولانا نے بتایا:

''۱۹۴۲ء عیسوی میں آل انڈیا ریڈیو دہلی نے مجھے اُردو کے مشیر ادبی کی حیثیت سے دہلی آنے کی دعوت دی تو میں چلا گیا۔ پانچ چھ سال کام کیا اس کے بعد ۲۷ ستمبر ۱۹۴۷ء عیسوی کو بڑی جان جوکھوں کے بعد ہوائی جہاز کے ذریعے لاہور واپس پہنچا۔''[۱۵]

۱۹۴۷ء میں جو قیامت پاک و ہند میں برپا ہوئی، اور دہلی میں بھی فتنہ و فساد اور قتل و

غارت، خونریزی کی آندھی تیزی سے چلنے لگی، تو مولانا حامد علی خان نے لاہور آنے کا فیصلہ کیا، مگر لاہور آنے سے پہلے اس پُرآشوب گھڑی میں جب سڑکوں گلیوں میں قتل و غارت کا بازار گرم تھا۔ آپ دہلی ریڈیو اسٹیشن گئے اور وہاں دفتر کی تمام امانتیں دفتر والوں کے سپرد کر کے واپس آئے۔ عبداللہ قریشی لکھتے ہیں:

منتخب اُردو اشعار کا مجموعہ ڈائریکٹر کے سامنے پیش کر کے کہا کہ چونکہ اب میرا دہلی میں رہنا ناممکن ہوگیا ہے۔ اس لیئے یہ امانت آپ کے سپرد کرتا ہوں۔ ڈائریکٹر نے ایک نظر مجموعہ اشعار پر ڈالی۔ پھر ان کی طرف دیکھا اور کہا: ''حامد علی خان! یہ تم نے اچھا نہیں کیا۔ تمہاری جان اس امانت سے زیادہ قیمتی ہے۔ میں حیران ہوں کہ تم یہاں کیسے پہنچے اور اب کس طرح گھر واپس جاؤ گے جب کہ بسوں کی آمدورفت بند ہوچکی ہے۔ کوئی دوسری سواری بھی نہیں ملتی اور اکیلے سڑک پر پیدل چلنا خطرے سے خالی نہیں ..... حامد علی خان جب ریڈیو اسٹیشن سے نکلے تو واقعی پریشان تھے کہ اب کس طرح گھر پہنچیں گے تھوڑی دور آگے بڑھے تو .....ایک تانگہ آ نکلا جس میں تین چار ہندو پہلے سے سوار تھے۔ یہ بھی اس میں لد گئے اور بچتے بچاتے کسی طرح گھر آ گئے۔''[۱۶]

اس طرح مولانا حامد علی خان ۲۹ ستمبر ۱۹۴۷ء کو لاہور پہنچے۔ کچھ مدت کے بعد مولانا حامد علی خان فیض احمد فیض سے ملے تو اُنہوں نے انہیں ''امروز'' اخبار کی ادارت کے لیے دعوت دی۔ مولانا حامد علی خان نے روز نامہ ''امروز'' میں تقریباً ایک سال سے بھی کم عرصے کام کیا پھر آپ حمید نظامی صاحب کی تحریک پر سر عبدالقادر کے رسالہ ''مخزن'' کے مدیر مقرر ہوئے۔ خالد لطیف نے انٹرویو میں بتایا:

''مولانا 'مخزن' کے مدیر تھے مگر ان کے پاس عملہ کوئی نہیں تھا۔ رسالے کی ادارت کا سارا کام انہیں خود کرنا پڑتا تھا۔ مضامین کا انتخاب خود کرتے تھے۔ کتابت کے بعد اس کی پروف ریڈنگ بھی خود کرتے تھے۔ خط و کتابت میں ان کا وقت صرف ہوتا تھا۔ صرف تجارتی

اور کاروباری معاملات ادارہ نوائے وقت کے ذمے تھے۔ 'مخزن' کے ادبی اور علمی معاملات کلیتاً مولانا حامد علی خان کے ذمے تھے۔'' ۱۷

مولانا حامد علی خان ۵۱۔۱۹۴۹ء تک ''مخزن'' نکالتے رہے۔ مولانا حامد علی خان نے ادارتی میدان میں اپنے تجربہ اور صلاحیتوں سے کام لیتے ہوئے ''مخزن'' کے قدیم قالب میں نئی جان پھونک دی۔ سعید مرتضیٰ زیدی نے مولانا سے سوال کیا کہ وہ بطور مدیر کن خصائص کو اپنے پیش نظر رکھتے تھے۔ اس پر مولانا حامد علی خان نے جواب دیا:

''میں مضامین میں منطقی استدلال کو بھی دیکھتا تھا۔ زبان کی صحت اور املاء کی صحت کو بھی خاص طور پر ملحوظ رکھتا تھا۔ ایک خاص معیار سے کمتر مضامین معذرت کے ساتھ واپس کر دیئے جاتے تھے۔'' ۱۸

نوائے وقت کا پریس بند ہو جانے کے باعث ''مخزن'' کی اشاعت رُک گئی، ''مخزن'' کے بعد مولانا نے اپنا رسالہ ''الحمرا'' جاری کیا۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی اس ضمن میں لکھتے ہیں:

''مولانا حامد علی خان بنیادی طور پر ادبی آدمی تھے۔ ادب ان کا اوڑھنا بچھونا تھا اس لیئے اُنہوں نے اپنے ذوقِ ادب کی تسکین کے لیے پہلے تو رسالہ 'مخزن' کی ادارت قبول کی اور کئی سال تک یہ رسالہ مولانا حامد علی خان کی ادارت میں نہایت سلیقے سے شائع ہوتا رہا۔ اور جب وہ بند ہو گیا تو مولانا نے اپنا رسالہ 'الحمراء' کے نام سے نکالنا شروع کیا اور کئی سال تک وہ اس رسالے کو نکالتے رہے۔'' ۱۹

مولانا حامد علی خان نے ''الحمراء'' کو بھی انہی خطوط پر استوار کیا جن پر ''ہمایوں'' اور ''مخزن'' گامزن تھے۔ یعنی اعلیٰ معیار کی صاف ستھری تحریریں اس میں شامل ہوتی تھیں۔ لیکن زمانہ تیزی سے بدل رہا تھا اور مولانا حامد علی خان قدیم روایات اور اقدار کو اپنا رہے تھے جو زمانہ جدید میں فرسودہ شمار ہونے لگی تھیں اور اس کے ساتھ ساتھ مولانا حامد علی خان کے پاس

سہولیات کا فقدان بھی تھا۔ لہٰذا ''الحمراء'' تقریباً چھ سال کے بعد بند ہو گیا۔

ڈاکٹر عبادت بریلوی ''الحمراء'' کے بارے میں لکھتے ہیں:

''مولانا کا رسالہ الحمراء بھی چند سال کے بعد بند ہو گیا۔ بہرحال اس رسالے کی چند سال کی فائلیں اس بات کی گواہ ہیں کہ مولانا نے اس میں اعلیٰ درجہ کا ادب شائع کیا اور ادب دوستوں کے لیے ان کے ادبی ذوق کی تسکین کا خاصا سامان فراہم کیا۔''[۲۰]

مولانا حامد علی خان کا ادبی سفر ''الحمراء'' کے بند ہونے کے ساتھ رُکا نہیں۔ بلکہ وہ ''الحمراء'' کے بعد ایک امریکی ادارے ''فرینکلن فاؤنڈیشن'' سے وابستہ ہو گئے۔ مولانا کے بیان کے مطابق:

''ستمبر ۱۹۵۵ء عیسوی میں موسیقہ مطبوعات فرینکلن میں ایڈیٹر کے طور پر میرا تقرر ہوا۔ ۱۹۵۶ء عیسوی میں فرینکلن کا ڈائریکٹر مقرر ہوا۔ تین ساڑھے تین سو سائنسی، تاریخی، طبی اور تعلیماتی کتابوں کے تراجم اُردو زبان میں اس ادارے کے تعاون سے شائع کرائے گئے۔ اکثریت سائنسی کتابوں کی تھی۔ اس ادارے کا اُردو نام میں نے خود موسیقہ فرینکلن رکھا تھا۔''[۲۱]

مکتبہ فرینکلن نے ترجموں کے حوالے سے ادب کی بہت خدمت کی۔ اسد اریب کے بقول فرینکلن نے بچوں کے لیے دو سو کتابوں کے تراجم کیے اور بچوں کے لیے بنیادی سائنس اور دلچسپ باتصویر کہانیوں کی کتابیں بھی شائع کیں وہ اس ضمن میں لکھتے ہیں:

''فرینکلن نے اُردو ادب میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا اور ایسی ایسی خوبصورت، باتصویر اور معلوماتی کتابیں بچوں کے لیے شائع کیں جو اس سے پہلے اُردو میں عام نہ تھیں خصوصاً تصویری کہانیوں کی اشاعت سے اس نے دوسرے اداروں میں ترغیب کا جذبہ پیدا کر دیا۔''[۲۲]

مولانا حامد علی خان کی کاوشوں سے امریکی کتابوں کے اُردو تراجم دھڑا دھڑ شروع

ہوئے جس سے لاہور کے کئی بیکار ادیبوں کو معقول روزگار حاصل ہوا اور اُردو زبان و ادب میں گراں قدر اضافہ ہوا۔ اس ضمن میں ڈاکٹر عبادت بریلوی لکھتے ہیں:

''اس ادارے کی ملازمت کو بھی اُنہوں نے ادبی خدمت کے طور پر قبول کیا کئی سال وہ اس ادارے میں رہے اور اُنہوں نے اس زمانے میں امریکی کتابوں کے تراجم بڑے سلیقے سے شائع کیے جس کی وجہ سے اس ادارے نے طباعت و اشاعت کی دنیا میں بڑا نام پیدا کیا۔''۲۳

مکتبہ فرینکلن ایک امریکی اشاعتی ادارہ تھا مگر مولانا نے اس سے وابستہ ہو کر بھی اپنی اقدار کو فراموش نہیں کیا۔ وہ کتابوں کے انتخاب میں بالکل آزاد تھے۔ اُنہوں نے وہ کتابیں شائع کیں جو موضوع کے علاوہ زبان و بیان کے سلسلے میں بھی بالکل بے داغ تھیں۔ مولانا حامد علی خان نے اپنے جذبہ حب الوطنی کے منافی کوئی اقدام نہیں کیا۔ لیکن اس کے باوجود بھی مولانا کی فرینکلن میں ملازمت کو ادبی حلقوں میں ناپسندیدگی کی نگاہ سے بھی دیکھا گیا کیونکہ مولانا کا تعلق بھی ایک ایسے خاندان سے تھا جو جذبہ ایمانی اور جذبہ حب الوطنی سے سرشار تھا، اور مولانا خود بھی اصول پسند اور محبِ وطن تھے۔ اس لیے مکتبہ فرینکلن کو لے کر مولانا پر اعتراضات بھی ہوئے۔ مثلاً یہ کہ امریکی مفادات کے فروغ کے لیے علمی شخصیات اور دانشوروں کو سیاسی رشوت دینے کا ایک آلہ کار تھے اسی طرح ایک اعتراض کا جواب شیخ نیاز احمد نے یوں دیا:

''میں یہ عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ نیاز مند نے فرینکلن کی مطبوعہ کتابیں نہیں دیکھیں۔ ورنہ انہیں یہ اندازہ ہو جاتا کہ وہ کتابیں تہذیب و حواشی کے ساتھ چھپ کر ایسی بن گئی ہیں کہ مسلمان ان سے بہترین قومی و اسلامی روحیت حاصل کر سکیں۔ لیکن سائنس کی کتب چھوڑ کر باقی کتابیں یا تو ان ممالک کی تاریخ سے تعلق رکھتی ہیں جو اسلامی مانے جاتے ہیں۔ ان میں اسلامی مسائل پر بحث کی گئی ہے..... میرے دل میں اپنے وطن کے اہل علم کی انتہائی

قدر و منزلت ہے اور میں پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ یہ کتابیں ان کی خدمت میں پیش کی جائیں تو یقیناً وہ فرمائیں گے کہ ہمارے ہاں اب تک ان مسائل و مضامین پر ایسی جامع کتابیں شاذ ہی لکھی گئی ہیں۔'' ۲۴

مولانا حامد علی خان نے کتابوں کے تراجم کے علاوہ شیخ نیاز احمد کے ساتھ مل کر مکتبہ فرینکلن کے تحت اُردو جامع انسائیکلوپیڈیا کی پہلی جلد بھی مرتب کی جس کے سرورق پر بطور مدیر اعلیٰ مولانا حامد علی خان کا نام درج ہے۔ محمد احسن خان کے نام اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں:

''اُردو دائرۃ المعارف کے بارے میں عرض ہے کہ جب فرینکلن کے دفاتر کی بساط لپیٹ لی گئی اس وقت بھی میں اس کتاب پر نظر ثانی میں مصروف رہا۔ اس فن کی تربیت میں نے کولمبیا یونیورسٹی کے پروفیسر ڈاکٹر ولیم برج والٹر اور اس فن کے بعض دوسرے امریکن ماہرین سے حاصل کی تھی ان میں ایک خاتون ماہر بھی تھیں جن کا نام میں بھول گیا ہوں میں کتاب کو فن اور موضوع کے لحاظ سے یکساں شکل میں ترتیب دے رہا تھا اور اس میں کانٹ چھانٹ اور بعض جگہ اضافے کی ضرورت بھی پڑتی تھی۔ یہاں کے بڑے بڑے ماہروں نے یہ کام کیا تھا مگر فن اور موضوع کے لحاظ سے اس میں یکساں شکل کی ترتیب اور کمی بیشی کی ضرورت تھی۔ جب میں ۳/۴ حصے پر نظر ثانی کر چکا جس میں اصلاحِ زبان کا کام بھی شامل تھا تو فرینکلن کا مرکزی امریکن دفتر بھی بند ہو گیا اور مجھ سے کہا گیا کہ تمام متعلقہ حوالے کی کتابیں جن میں انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا کے علاوہ ان گنت دوسری بیش بہا کتابیں بھی تھیں، ناشر کے حوالے کر دی جائیں اور تقریباً چالیس ہزار روپے بھی ناشر کو دے دیئے جائیں تاکہ بقیہ کام وہ خود کر لے چنانچہ وہی کیا گیا۔'' ۲۵

مولانا حامد علی خان نے اُردو جامع انسائیکلوپیڈیا میں جس محنت و لگن سے کام کیا اس کا اعتراف شیخ نیاز احمد نے انسائیکلوپیڈیا کے دیباچہ میں کیا ہے:

''مولانا حامد علی خان اور مسٹر ڈیٹس۔ سی۔ سمتھ ہمارے دلی شکریہ کے مستحق ہیں کیونکہ اگر ہمیں ان کی سرپرستی اور تعاون حاصل نہ ہوتا تو یہ انسائیکلوپیڈیا کبھی پایۂ تکمیل کو نہ پہنچتا۔''۲۶

مولانا حامد علی خان کا مرتب کردہ ''دیوانِ غالب'' ۱۹۶۹ء میں منظر عام پر آیا۔ تحقیقِ متن اور ترتیبِ متن کا کام مولانا نے انجام دیا۔ جبکہ حُسنِ کتابت اور آرائشِ اوراق پاکستان کے نامور خطاط نفیس رقم نے کی اور جناب عبدالرحمٰن چغتائی نے آرائشی بیل بوٹے فراہم کیے۔ ''دیوان غالب'' کے حرفِ آغاز میں مولانا نے لکھا ہے:

''یہ کام شروع کرنے سے پہلے جتنا مشکل نظر آیا تھا۔ شروع کر دینے کے بعد اس سے دس گناہ زیادہ دقت اور ذمہ داری کا متقاضی نظر آیا کیونکہ قدیم و جدید متداول نسخے سب کے سب باہم دِگر بے حد مختلف ثابت ہوئے اور ان میں اغلاطِ متن اور اختلافِ ترتیب غزلیات و اشعار کی وہ ریل پیل نظر آئی کہ سر چکرا گیا۔''۲۷

ڈاکٹر سید عبداللہ نے مولانا حامد علی خان کے نام اپنے ایک خط میں مولانا کے مرتب کردہ ''دیوانِ غالب'' کے بارے میں لکھا ہے:

''کل میں نے فرصت پاکر آپ کے مرتب کردہ 'دیوانِ غالب' (اُردو) پر نظر ڈالی۔ بلاتکلف عرض ہے کہ بعض مشکلاتِ غالب جن کے بارے میں اکثر خلجان رہتا تھا۔ یوں حل شدہ محسوس ہوئیں کہ شائبہ تردد بھی باقی نہ رہا۔ باور آیا ہمیں پانی کا ہوا ہو جانا۔ آپ نے اعراب کا اہتمام کر کے نہ صرف طلبہ کے لیئے بلکہ خود مدرسین کے لیئے بڑا نیک کام کیا ہے۔ چلیئے مجلس یادگار غالب نے منجملہ دوسرے اچھے کاموں کے، یہ کام، بہت عمدہ کر دیا.....''۲۸

۱۹۶۹ء میں پنجاب یونیورسٹی نے غالبؔ کا صد سالہ جشن منایا اور ایک کمیٹی تشکیل دی گئی جس میں مولانا حامد علی خان کو بھی شامل کیا گیا۔ اس کے علاوہ مولانا حامد علی خان مقتدرہ قومی زبان کی گورننگ باڈی کے ممبر بھی رہے۔ زاہد علی خان نے اپنے انٹرویو میں بتایا:

''مولانا حامد علی خان تقریباً دو سال تک مقتدرہ سے منسلک رہے اور یہ باتیں درست نہیں کہ ان کا مقتدرہ سے کوئی تعلق نہیں۔''[۲۹]

جبکہ سعید احمد خان نے اپنے مضمون ''حامد علی خان'' میں اس بات پر عدم رضا مندی کا اظہار کیا ہے کہ مولانا کی مقتدرہ میں شمولیت تھی۔ وہ لکھتے ہیں:

''۱۹۸۰ء میں ان کے دیرینہ دوست میجر آفتاب حسن نے انہیں ٹیلی فون پر بتایا کہ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی انہیں مقتدرہ قومی زبان کا رُکن بنانے کے خواہش مند ہیں۔ حامد علی خان اس میں شامل نہیں ہونا چاہتے تھے۔ کہنے لگے کہ اُردو کی ترقی و ترویج کے لیئے کافی بورڈ بنائے جاچکے ہیں۔ اب کوئی کسر باقی ہے تو وہ یہ کہ اُردو کو کسی چوراہے میں باندھ کر ۲۰ کوڑے لگائے جائیں اور وہیں پر اس کو پھانسی دے دی جائے۔''[۳۰]

تاہم مولانا حامد علی خان کے صاحبزادے زاہد علی خان کے بقول مولانا تقریباً دو سال تک مقتدرہ میں رہے اور کراچی میں ہونے والے اجلاسوں میں بھی شرکت کرتے رہے۔

مولانا حامد علی خان نے اپنی زندگی کے آخری اٹھارہ بیس برس عزلت نشینی میں گزارے۔ بیگم حامد علی خان نے بتایا کہ ۱۹۸۴ء میں مولانا کو گردن توڑ بخار ہوا۔ انہیں عمر ہسپتال داخل کرایا گیا۔ جہاں پنسلین کے زیادہ استعمال سے مولانا کے سانس میں خرخراہٹ کی آواز پیدا ہوگئی۔ اور تیز بخار کے باعث ان کی ٹانگ کو فالج ہوگیا اور پھر نومبر ۱۹۹۴ء کو بدقسمتی سے ان کے کولہے کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ اس وقت مولانا کی عمر تقریباً ۹۴ سال تھی۔ آپریشن کے ذریعے ہڈی میں سریا ڈال کے ہڈی تو جوڑ دی گئی۔ لیکن مولانا سہارے سے چلتے تھے یا وہیل چیئر کی مدد لیتے تھے۔ ۲۶ اگست ۱۹۹۵ء کو مولانا کی حالت پھر خراب ہوگئی آپ کو ہسپتال لے جایا گیا جہاں آپ کومے میں چلے گئے۔ ۱۴ اکتوبر کو ان کو بے ہوشی کی حالت میں گھر لایا گیا اور ۱۵ اکتوبر صبح کے ۸ بجے مولانا اس جہانِ فانی سے کوچ کر گئے۔ ''اَنا لِلّٰہ وانا الیہِ رَاجعون''

مرنے والے مرتے ہیں لیکن فنا ہوتے نہیں

یہ حقیقت میں کبھی ہم سے جُدا ہوتے نہیں

مولانا حامد علی خان بہت وضعدار انسان تھے اور وضعداری نبھانا بھی جانتے تھے۔ مولانا حامد علی خان تمام عُمر ''مولانا'' کہلاتے رہے۔ لیکن وہ اپنی وضع قطع سے بالکل مولانا نہیں لگتے تھے۔ خالد لطیف مولانا کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے بتاتے ہیں (یہ ان کی مولانا سے پہلی مُلاقات تھی)۔

''بھرا بھرا چہرہ، چمکتی آنکھیں، تبسم زیرلب، گٹھا ہوا جسم، دراز قد نہیں تو کوتاہ قد بھی نہیں۔ بادامی رنگ کے سوٹ میں ملبوس۔ مولانا حامد علی خان۔ میں بمبئی سے آیا تھا۔ بمبئی میں داڑھی کے بغیر مولانا کا تصور نہیں تھا..... تعجب ہوا کہ مولانا کے داڑھی کیوں نہیں ہے۔''[۳۱]

مولانا حامد علی خان خوبصورت، صحت منداور پُرکشش شخصیت رکھتے تھے۔ اپنی زندگی میں ہر کام وقت پر کرتے۔ بہت نفاست پسند طبیعت کے مالک تھے۔ ہر کام قرینے اور نظم وضبط کے ساتھ انجام دیتے رہے۔ ان کی نفیس طبیعت کے نہ صرف ان کے اہل خانہ بلکہ احباب اور ہمسائے تک معترف ہیں۔ مولانا لباس کے معاملے میں بھی بہت خوش لباس اور خوش ذوق واقع ہوئے تھے اور سوٹ اور ٹائی کے بغیر کبھی دفتر نہیں جاتے تھے۔ گرمیوں میں بوشرٹ پہنتے تھے۔ شلوار کی جگہ ہمیشہ حیدر آبادی پاجامہ زیب تن کرتے تھے۔ بیگم حامد علی خان نے بتایا:

''مولانا اپنے کپڑے خود استری کرتے تھے۔ اور انہیں ہمیشہ ہینگر میں لگا کر رکھتے تھے۔ مولانا کے کپڑوں پر کبھی کوئی نشان یا داغ نہیں نظر آتا تھا اور اسی طرح کی اُن کی زندگی بھی تھی بے داغ۔''[۳۲]

بیگم حامد علی خان نے یہ بھی بتایا کہ مولانا کسی سے بھی ملتے تھے تو تیار ہو کر ملتے تھے۔ تصاویر اُتروانے میں محتاط تھے بالخصوص بڑھاپے میں تو وہ تصویر کھنچوانا پسند نہیں کرتے تھے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ یہ نہیں چاہتے تھے کہ لوگوں کو اُن کو اس حالت میں دیکھ کر

تکلیف ہو۔ کیونکہ اُن کے ہاتھوں میں رعشہ آ گیا تھا۔ جسمانی حالت نہایت کمزور ہوگئی تھی۔ اس لیئے وہ لوگوں سے ملنے سے بھی انکار کر دیتے تھے کہ لوگ ان کی یہ حالت دیکھ کر اُن سے اظہار ہمدردی کریں گے جو اُنھیں پسند نہیں تھا اور اسی وضعداری نے انہیں اُن کے گھر میں محبوس کر دیا تھا۔ جہاں سے وہ ایک دن خاموشی سے اس راہ پر چلے گئے جہاں سے کوئی واپس لوٹ کر نہیں آتا۔

مولانا حامد علی خان کی بیگم نے مزید بتایا کہ کھانے پینے میں مولانا کو سادہ غذا پسند تھی اس کے ساتھ وہ سبزی، پھل، دودھ کا باقاعدگی سے استعمال کرتے تھے۔ کھانے میں بُھنا ہوا قیمہ خاص طور پر پسند تھا۔ کھانے پینے کے معاملات میں وہ بہت نفاست پسند تھے انٹرویو میں زاہد علی خان نے بتایا:

''کھانے کے دوران کبھی کوئی مکھی اردگرد گھومتی بھی نظر آتی تو آپ کھانا چھوڑ دیتے تھے۔''[۳۳]

مولانا حامد علی خان کی شخصیت کا ایک اور خاص پہلو نظم و ضبط تھا۔ وہ صبح کی سیر باقاعدگی سے کرتے تھے اور اس میں کبھی تعطل واقع نہیں ہوا تھا۔ زاہد علی خان صُبح کی سیر میں ہمیشہ مولانا کے ساتھ ہوتے تھے۔ انٹرویو میں اُنہوں نے بتایا:

''میں اُن کے ساتھ صُبح کی سیر کے لیئے جاتا تھا۔ سیر کے دوران مختلف امور پر بات بھی ہوتی تھی۔ اُن میں سے ایک خاص بات یہ تھی کہ ابا جی کہتے تھے کہ ترقی پسند تحریک کے بارے میں لکھا تھا کہ ترقی پسند تحریک سے مُراد غریبوں کی حمایت ہے تو میں ان کے ساتھ ہوں۔ اور اگر ترقی پسندی سے مُراد پاکستان کی نوزائیدہ مملکت کو نقصان پہنچانا ہے تو میں ایسے شخص کو مسلم دُنیا کا مُجرم سمجھتا ہوں۔''[۳۴]

بیگم حامد علی خان نے اپنے انٹرویو میں یہ بات بھی واضح کی کہ مولانا کا تعلق کبھی بھی کسی تحریک سے نہیں رہا۔ انہیں مسلم لیگ والوں نے بھی بُلایا مگر وہ شامل نہ ہوئے۔ مگر اسلامی

تحریک سے وابستہ تھے اور مسلمانوں کی حمایت ہی میں وہ تمام عُمر رہے۔ مولانا نے ہمیشہ پابندیِ وقت کو ملحوظِ خاطر رکھا۔ دیر سے کہیں جانا یا کسی کا اپنے مقررہ وقت پر نہ آنا انہیں بالکل پسند نہیں تھا۔ کھانے پینے کے معاملات میں بھی وقت کے پابند تھے اور اپنی ملازمت کے معاملے میں بھی ہمیشہ وقت کی پابندی کی۔ بیگم حامد علی خان نے بتایا:

''مولانا شادیوں پر جب جاتے تو کھانا گھر سے کھا کر جاتے تھے اور وقت مقررہ سے بھی پانچ دس منٹ پہلے ہی پہنچ جاتے تا کہ دیر نہ ہو۔'' ۳۵

مولانا بہت صاف گو، اُصول پسند اور کھرے مزاج کے فرد تھے۔ سفارش اور رشوت کے سخت خلاف تھے۔ ایک عرصے تک آپ ایم۔ اے اُردو اور عربی کے پرچوں کی مارکنگ کرتے رہے۔ مگر کبھی کسی کی سفارش نہیں مانی۔ بیگم حامد علی خان نے بتایا:

''لوگ پرچوں کے پیچھے آتے تھے تو مولانا بہت سختی سے پیش آتے اور ناجائز کام سے فوراً انکار کرتے تھے۔'' ۳۶

مولانا کا یہی رویہ اپنے بچوں کے ساتھ بھی تھا۔ وہ اپنے بچوں کی سفارش بھی نہیں کرتے تھے۔ سکول یا کالج میں داخلے کے لیے بھی یہ ہی بات کہتے کہ خود جاؤ۔ اگر داخل ہو سکتے ہو تو ٹھیک ورنہ کوئی دوسرا کام کرو۔ مولانا کا یہ ہی اُصول اپنی ملازمت میں بھی برقرار رہا۔ مولانا حامد علی خان کی طبیعت میں بہت متانت تھی۔ بیگم زاہد علی خان نے راقمہ کو انٹرویو میں بتایا کہ:

''وہ بہت شائستہ طبیعت کے مالک انسان تھے۔ بہت عزت و احترام سے بُلاتے۔ اُن کی باتوں سے علمیت ٹپکتی تھی۔ وہ بہت با اُصول انسان تھے۔'' ۳۷

مولانا حامد علی خان ایک محبِ وطن انسان تھے۔ پاکستان سے بہت محبت کرتے تھے اور کبھی بھی پاکستان کے خلاف نہ تو کوئی بات سُنتے اور نہ ہی سُننا گوارا کرتے تھے۔ بیگم حامد علی خان نے راقمہ کو اپنے انٹرویو میں بتایا کہ:

''مولانا نے اپنے آخری دنوں میں اس غم کا اظہار کیا کہ افسوس ہم آزاد نہیں ہوئے۔ ہم آج بھی غلام ہیں۔ قائداعظم نے اتنی محنت کی اتنا کچھ کیا مگر ہمیں حاصل کچھ نہ ہوا۔''۳۸

مولانا حامد علی خان کو سوشلسٹوں سے سخت نفرت تھی۔ مولانا سچ بات کہنے سُننے کے قائل تھے۔ اور اگر کوئی کسی کی خوشامد کرتا یا کرنے کے لیئے کہتا، تو وہ کبھی برداشت نہیں کرتے تھے۔ بیگم حامد علی خان نے انٹرویو میں بتایا کہ اُن کے مزاج میں تب شدّت آجاتی جب وہ کو ئی ناحق کام کو ہوتے ہوئے دیکھتے اور چاہے اُنھیں کتنی ہی مخالفت کا سامنا کرنا پڑتا، مگر غلط کام کا کبھی ساتھ نہ دیتے۔ اس سلسلے میں اُنہوں نے فیض احمد فیضؔ کے بارے میں ایک واقعہ سُنایا۔ (یہ واقعہ فیض کی رہائی کے خط پر دستخط کا ہے)۔

''فیض احمد فیضؔ کو چار سال کی جیل ہوئی اور جب چار مہینے جیل کے (سزا کے) رہ گئے تو تمام ادیبوں نے رہائی کے لیئے درخواست دی اور تمام فیضؔ کے خیر خواہوں نے دستخط کر دیئے جن میں کچھ کے نام میرے ذہن میں ہیں جن میں میاں بشیر احمد اور پروفیسر حمید احمد خان بھی شامل تھے اور اُن سب نے دستخط کر دیے مگر مولانا نے اُس درخواست پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا اور کہا کہ تم اچھے دوست ہو فیضؔ کے۔ اتنا کشت سختی اُس نے جیل میں کاٹی اب چار مہینے رہ گئے تم لوگ اُس سے معافی منگوا رہے ہو۔ تم اُس کا مشن خراب کر رہے ہو۔ جہاں اتنی سختی کاٹی ہے فیضؔ صاحب نے، وہ یہ چار مہینے بھی کاٹ سکتے ہیں۔ اس کے بعد پروفیسر حمید احمد خان کو بھی اپنے دستخط کرنے پر شدید افسوس ہوا۔''۳۹

مولانا حامد علی خان کو ضیاء الحق سے بھی اختلاف تھا۔ جس کا اظہار ان کے خطوط سے ہوتا ہے جو اُنہوں نے محمد احسن خان کو لکھے۔ ایک خط میں لکھتے ہیں:

''حال ہی میں عبدالقادر حسن نے 'جنگ' میں لکھا تھا۔ 'صدر صاحب نے پہلے فرمایا تھا کہ میں انتخابات میں اپنے مشیروں کی مدد کروں گا۔ صدر صاحب ہر قسم کے مذاق کرتے

رہتے ہیں مگر مشیروں نے مذاق کو نہ سمجھا اور ان کی مدد پر بھروسا کر کے بیٹھ گئے۔' کیا آپ اتنے بڑے مومن کے مذاق کو مزاح المومنین میں شمار کرنا درست نہیں سمجھتے؟ اُنہوں نے بے شمار حج اور عُمرے کئے ہیں۔ وہ نمازی ہی نہیں، امامت بھی فرماتے ہیں۔ روزے یقیناً رکھتے ہوں گے۔ اسلام کو دوبارہ بڑے جوش سے نازل کر رہے ہیں۔ امیر المومنین ہیں مزاح المومنین کا حق رکھتے ہیں۔'' ۴۰

اس خط سے مولانا کے لہجے میں پائی جانے والی سختی کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ اس لیئے مولانا زندگی میں کبھی کسی تحریک سے وابستہ ہونے یا گروہ بندی کرنے یا حاکمِ وقت کی خوشامد کرنے کے قائل نہ تھے اس لیئے وہ اپنے دوست بھی بہت کم بناتے تھے۔ آپ کے خاص دوستوں میں منصور احمد خان سے آپ کو بہت محبت تھی۔ اس کے علاوہ بقول زاہد علی خان مولانا حامد علی خان، صلاح الدین احمد سے بھی بہت پیار کرتے تھے وہ ان کے بچپن کے دوست تھے۔ اس لیئے اُن سے خاص عقیدت تھی۔

مولانا حامد علی خان کو شاعروں میں شاعر مشرق، علامہ اقبال پسند تھے اور آخری عُمر میں جوش کو پڑھتے تھے اور اُسے پسند کرتے تھے۔ اسی طرح بیگم حامد علی خان نے مولانا کی پسند و ناپسند کے متعلق بتایا کہ:

''مولانا کو اشفاق احمد کا ''تلقین شاہ'' بہت پسند تھا اور افسانے میں ان کو ٹیگور کے افسانے پسند تھے۔ اِن کا اُنہوں نے اُردو ترجمہ بھی کیا۔'' موسیقی میں مولانا غزلیات کبھی کبھی سُنتے تھے زیادہ نہیں۔'' ۴۱

مولانا حامد علی خان اپنے بچوں کے تعلیمی امور کو بہت ذمہ داری سے پورا کرتے تھے۔ بچوں سے محبت تو کرتے تھے مگر ظاہر نہ کرتے تھے۔ پاکیزگی کی عادت کی وجہ سے اکثر بچوں کو گود میں نہیں اٹھاتے تھے، کہ کہیں کپڑے گندے نہ ہوں۔ اس کی وجہ بیگم حامد علی خان نے بتائی:

''مولانا پابندِ صوم صلوٰۃ تھے اور عالمِ شباب میں وہ بہت نمازی تھے۔ اگر کبھی وہ سمجھتے کہ نماز میں کوئی غلطی ہوگئی ہے تو دوبارہ نماز ادا کرتے تھے۔ اس لیئے بچوں سے دور رہتے کہ کہیں بچوں کے ہاتھ گندے نہ ہوں اور کپڑوں کو ناپاک نہ کر دیں۔''[۴۲]

بیگم حامد علی خان نے بتایا کہ مولانا حامد علی خان نے میرے آرام کا بہت خیال رکھا۔ اور مولانا کی رفاقت میں میں نے زندگی بہت خوشگوار گزاری۔ اُنہوں نے بتایا کہ مولانا اپنے تمام کام خود کرتے تھے۔ کپڑے تک خود استری کرتے تھے اور مجھ سے بھی یہی کہتے تھے کہ بچوں کو بھی خود کام کرنے کی عادت ڈالو، تاکہ آگے زندگی میں انہیں کوئی پریشانی نہ ہو۔ بس اگر مولانا کو کوئی پریشانی یا افسوس تھا تو وہ یہی کہ اُردو زبان کی اب وہ قدر اور اہمیت نہیں رہی جو ہونی چاہیے تھی اور لوگ اب اپنے ورثے کو بھولتے جا رہے ہیں۔ مولانا کا اُردو زبان سے لگاؤ جعفر بلوچ کے مندرجہ ذیل بیان سے بھی ہوتا ہے:

''مولانا کی اُردو دوستی کی ایک روشن شہادت یہ بھی ہے کہ وہ اپنی دینی اور قومی عصبیت کے پابند اور نگہبان ہوتے ہوئے بھی ان غیر مُسلم اہل قلم کے احترام اور قدر افزائی میں ہمیشہ پیش پیش رہے، جنہوں نے اُردو زبان و ادب کی خدمت میں حصہ لیا ہے۔ اس سلسلے میں ماسٹر پیارے لال آشوب، سرتیج بہادر سپرو، پنڈت دتاتریا کیفی، تلوک چند محروم، جوش ملسیانی اور جگن ناتھ آزاد کے نام خصوصاً قابل ذکر ہیں۔ زبان و بیان کی لطافتوں اور باریکیوں کو سمجھنے اور برتنے سے مولانا کو عمر بھر شغف رہا۔ متعدد مروج اصطلاحات مثلاً برصغیر، خود ارادیت، ہنگامی حالت وغیرہ کے صحیح مفہوم کی تعین و ترویج کے سلسلے میں ان کے دلائل چشم کشا اور بصیرت افروز ہیں۔''[۴۳]

مولانا حامد علی خان کی ادب سے محبت کا بیان ڈاکٹر وحید قریشی نے ان الفاظ میں کیا:

''بیسویں صدی میں پنجاب میں جن ادیبوں کی علمی کارگزاریوں کی دھاک بیٹھی،

ان میں مولانا ظفر علی خان کے خانوادے کو مرکزی اہمیت حاصل ہے۔ مولانا حامد علی خان نے ادبی صحافت، انشاء پردازی اور شاعری میں ناموری حاصل کی۔ خصوصاً لسانی اُمور میں ان کے معاصرین انہیں بطور سند پیش کرتے تھے۔''[۴۴]

مولانا حامد علی خان کا تصنیفی سرمایہ، مختلف اخبارات، رسائل کی صورت میں محفوظ ہے اور مولانا کے صاحبزادوں نے اُن میں سے کافی سرمائے کو کتابوں کی صورت میں شائع کیا ہے۔ مگر ابھی بھی کچھ مواد ایسا ہے جو شائع نہیں ہو سکا۔ مولانا نے اپنی منکسر المزاجی اور کم نمائی کی وجہ سے اپنی نگارشات کی ترتیب و تدوین اور اشاعت میں بے اعتنائی برتی جس کی وجہ سے اُن کی زندگی میں اُن کا بہت کم تصنیفی و تالیفی سرمایہ زیورِ طبع سے آراستہ ہوا۔ ان میں سے ایک ''افسانہائے عشق'' جو ان کے ترجمہ کردہ افسانوں کا مجموعہ ہے۔ ''حامد کے سو شعر'' جو کہ منصور احمد خان نے ایک کتابچے کی شکل میں چھپوائے۔ اور ''دیوان غالبؔ''۔ جو مولانا نے مرتب کیا تھا وہ ان کی زندگی میں شائع ہوا، اور بہت مقبول بھی ہوا۔ اس کے علاوہ مولانا حامد علی خان کا ایک کارنامہ اُردو جامع انسائیکلوپیڈیا ہے جو ادارہ فرینکلن کے تعاون سے ترتیب و اشاعت کے مراحل سے گزرا مگر مولانا علالت کے باعث اس کو تکمیلی مراحل تک نہ پہنچا سکے اور آخری صورت میں جناب زاہد حسین انجم کو مکمل کرنے کی سعادت حاصل ہوئی۔

مولانا کے مزاج میں شائستگی اور پاکیزگی طبیعت میں عرق ریزی اور مشکل پسندی کا رُجحان ظاہر ہوتا ہے۔ ان کی تحریروں میں سادگی سلاست کا خاصا پایا جاتا ہے اس کے ساتھ ساتھ کہیں کہیں سختی کا عنصر بھی ہے۔ آپ کی تحریریں دعوت فکر و عمل دیتی ہیں آپ نے ادب کی آبیاری کے لیئے لفظ و معنی کی کھاد میں مثبت پاکیزہ بیج بو دیئے ہیں اور آگے بڑھنے کے لیے راستے کو صاف کیا تاکہ ادب کی دُنیا میں نئے آنے والوں کے لیئے مشکلات پیدا نہ ہو۔

مولانا حامد علی خان کی وفات کو ایک عرصہ بیت گیا ہے لیکن وہ آج بھی الحمراء کی صورت میں زندہ ہیں اور اُردو کی شکل میں جاوداں ہیں۔ ابراہیم ذوقؔ کا یہ شعر اس بات کی

تصدیق کرتا ہے:

رہتا ہے سخن سے نام قیامت تلک ذوقؔ
اولاد سے تو بس یہی دو پشت، چار پشت

حواشی

۱۔ بحوالہ انٹرویو: مطبوعہ روزنامہ جنگ۔ ۶ جولائی ۱۹۸۳ء
۲۔ عبداللہ قریشی۔نقوش (شخصیات نمبر) ص ۱۰۰۸
۳۔ راقمہ کا بیگم حامد علی خان سے انٹرویو ۲۹ اگست۔ ۲۰۰۶ء
۴۔ عبداللہ قریشی، نقوش (شخصیات نمبر) ص ۱۰۰۸
۵۔ عبداللہ قریشی۔نقوش شخصیات نمبر) ص ۱۰۰۸
۶۔ بحوالہ انٹرویو مطبوعہ جنگ ۶ جولائی ۱۹۸۳ء
۷۔ عبداللہ قریشی، نقوش (شخصیات نمبر ص ۱۰۱)
۸۔ بحوالہ انٹرویو مطبوعہ جنگ مورخہ ۶ جولائی ۱۹۸۳ء
۹۔ بحوالہ انٹرویو مطبوعہ جنگ ۶ جولائی ۱۹۸۳ء
۱۰۔ عبداللہ قریشی، نقوش، شخصیات نمبر، ص ۱۰۰۹
۱۱۔ راقمہ کا بیگم حامد علی سے انٹرویو ۲۹ اگست ۲۰۰۶ء
۱۲۔ بحوالہ انٹرویو، مطبوعہ جنگ، ۶ جولائی ۱۹۸۳ء
۱۳۔ راقمہ کا بیگم حامد علی سے انٹرویو مورخہ ۲۹ اگست ۲۰۰۶ء
۱۴۔ اخلاق احمد دہلوی، روزنامہ مشرق، ۵ فروری ۱۹۸۰ء
۱۵۔ بحوالہ انٹرویو، روزنامہ جنگ، ۶ جولائی ۱۹۸۳ء
۱۶۔ عبداللہ قریشی۔نقوش شخصیات نمبر، ص ۱۰۱۰
۱۷۔ راقمہ کا خالد لطیف سے انٹرویو، مورخہ ۲۵ اکتوبر ۲۰۰۶ء
۱۸۔ بحوالہ انٹرویو مطبوعہ جنگ، ۶ جولائی ۱۹۸۳ء
۱۹۔ عبادت بریلوی، ڈاکٹر، الحمراء جنوری ۲۰۰۴ء۔ ص ۸
۲۰۔ عبادت بریلوی، ڈاکٹر، الحمراء جنوری ۲۰۰۴ء۔ ص ۸
۲۱۔ بحوالہ انٹرویو مطبوعہ جنگ ۶ جولائی ۱۹۸۳ء۔

۲۲۔ اسد اریب۔ اُردو میں بچوں کا ادب۔ ص ۴
۲۳۔ عبادت بریلوی، ڈاکٹر، الحمراء جنوری ۲۰۰۴ء۔ ص ۸
۲۴۔ شیخ نیاز احمد، روزنامہ امروز، ۸ ستمبر ۱۹۶۳ء
۲۵۔ حامد علی خان، مکتوب بنام محمد احسن خان، ۲ ستمبر ۱۹۸۴ء
۲۶۔ شیخ نیاز احمد۔ اُردو جامع انسائیکلو پیڈیا۔ ص ۲
۲۷۔ حامد علی خان۔ دیوان غالب۔ حرف آغاز
۲۸۔ زاہد علی خان مکاتیب مشاہیر ادب بنام مولانا حامد علی خان (مرتبہ) ۲۰۰۱ء۔ ص ۴۶۹
۲۹۔ راقمہ کا زاہد علی خان سے انٹرویو۔ ۲۹ اگست ۲۰۰۶ء
۳۰۔ سعید احمد خان۔ سیارہ۔ دسمبر ۱۹۹۵ء۔ ص ۱۸۴
۳۱۔ راقمہ کا خالد لطیف سے انٹرویو، ۲۵ اکتوبر ۲۰۰۶ء
۳۲۔ راقمہ کا بیگم حامد علی خان سے انٹرویو۔ مورخہ ۲۹ اگست ۲۰۰۶ء
۳۳۔ راقمہ کا زاہد علی خان سے انٹرویو مورخہ ۲۹ اگست ۲۰۰۶ء
۳۴۔ راقمہ کا زاہد علی خان سے انٹرویو مورخہ ۲۹ اگست ۲۰۰۶ء
۳۵۔ راقمہ کا بیگم حامد علی خان سے انٹرویو۔ ۲۹ اگست ۲۰۰۶ء
۳۶۔ راقمہ کا بیگم حامد علی خان سے انٹرویو مورخہ ۲۹ اگست ۲۰۰۶ء
۳۷۔ راقمہ کا بیگم زاہد علی خان سے انٹرویو مورخہ ۲۹ اگست ۲۰۰۶ء
۳۸۔ راقمہ کا بیگم حامد علی خان سے انٹرویو۔ ۲۹ اگست ۲۰۰۶ء
۳۹۔ راقمہ کا بیگم حامد علی خان سے انٹرویو۔ ۲۹ اگست ۲۰۰۶ء
۴۰۔ حامد علی خان مکتوب بنام محمد احسن خان مورخہ ۱۶ ستمبر ۱۹۸۴ء
۴۱۔ راقمہ کا بیگم حامد علی خان سے انٹرویو۔ ۲۹ اگست ۲۰۰۶ء
۴۲۔ راقمہ کا بیگم حامد علی خان سے انٹرویو۔ ۲۹ اگست ۲۰۰۶ء
۴۳۔ جعفر بلوچ۔ نقائس ادب۔ (مرتبہ) ۲۰۰۴ء۔ ص ۱۹۔۱۸
۴۴۔ ڈاکٹر وحید قریشی سے راقمہ کا انٹرویو ۷ ستمبر ۲۰۰۶ء